© rasailojaraid.com

ارباب اخلاص کی جدوجہد اسی طرح جاری رہی تو امید ہے ہمارا یہ پرانا خواب ایک دن ضرور سچ ثابت ہوکر رہیگا۔

واقعہ یہ ہے کہ درسِ نظامی تین قسم کے علوم وفنون پر مشتمل ہے (۱) علومِ دینیہ۔ جیسے تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ۔ (۲) علومِ آلیہ یعنی وہ علوم جس سے علومِ دینیہ کے فہم وتفہیم میں مدد لینا ناگزیر ہے جیسے صرف ونحو۔ ادب۔ معانی وبیان۔ فن بلاغت وبدیع۔ (۳) علوم عقلیہ، ان سے مراد وہ علوم ہیں جو نہ خود دین ہیں اور نہ جن سے علومِ دینیہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ علوم عصریہ تھے۔ علمائِ اسلام نے شروع شروع میں ان علوم کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت کی لیکن جب دیکھا کہ یہ اربابِ باطل کا ہتھیار بن گئے ہیں تو انھوں نے خود ان علوم کو پڑھا اور ان پر تنقید کرکے مسائلِ دین کے مقابلہ میں ان کی اثر آفرینی ختم کردی چنانچہ امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ پھر علامہ ابنِ رشد المتوفی ۵۹۵ھ کی تہافت التہافت جس میں علامہ نے اگرچہ امام غزالیؒ سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن بہرحال خود بھی امام کی غرض وغایت کی تکمیل ہے اور اس کے بعد خواجہ زادہ (م ۸۹۳ھ) کی تہافت الفلاسفہ جو انھوں نے سلطان محمدؒ فاتح قسطنطنیہ کے ایما سے لکھی تھی، یہ اور ان کے علاوہ حافظ ابنِ تیمیہؒ کی "الردعلی المنطقین" اور امام رازیؒ کی شرح اشارات یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان علوم میں منطق اور فلسفہ شامل ہیں جن کو ہمارے قدیم نصاب تعلیم میں نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے اور اب بھی مدارسِ عربیہ کے طلبا کے کئی قیمتی سال انھیں کے نذر ہوجاتے ہیں۔ ان علوم کے علاوہ مدارس میں ہیئت اور تاریخ کی بھی دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اول الذکر کا مقصد محض ایک عصری فن کا جاننا اور تاریخ کا مقصد اپنے اسلاف کے کاموں اور کارناموں سے واقف ہونا تھا ہمارا درسِ نظامی جو ملا نظام الدین سہالی المتوفی ۱۱۶۸ھ کی طرف منسوب ہے۔ بس انھیں مقاصد کو سامنے رکھکر بنایا گیا تھا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جو عمدہ سے عمدہ اور مفید کتابیں دستیاب ہوسکتی تھیں ان کو درس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ درسِ نظامی کی اس ہیئتِ ترکیبی سے اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک "دینی تعلیم" کی اسپرٹ کیا تھی یعنی وہ صرف دین کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے نزدیک عالم بننے کے لئے علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کا مطالعہ اور ان سے واقف ہونا بھی لازمی تھا۔

اب ان مقاصدِ تعلیم کو سامنے رکھکر درسِ نظامی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اُس کی موجودہ ہیئت دینی اور عصری علوم دونوں کی تعلیم کے لحاظ سے سراسر ناقص اور مقاصد کے لئے غیر مفید ہے اور غیر افادیت کی وجہ جس طرح نصاب تعلیم ہے اس نصاب کا طریقۂ تعلیم بھی بڑی حد تک اس کا سبب ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں جیسا کہ آجکل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ کلاسوں میں ہوتا ہے طریقۂ تعلیم املا تھا۔ استاد کسی مسئلہ پر فنی حیثیت سے کلام کرتا تھا اور تلامذہ اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے اس طرح تعلیم کسی خاص ایک کتاب کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی تھی اور طلبا کو استاذ کے لکچروں کے ذریعہ فنی بصیرت و مہارت پیدا ہوجاتی تھی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ استاد کی تمامتر توجہ کتاب کی عبارتی پیچیدگیوں اور مصنف کے مافی الضمیر کی تشریح و تفصیل پر مرکوز رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی پڑھتا ہے مگر اسے نحو نہیں آتی منطق میں سلم اور ملا حسن پڑھتا ہے مگر منطق سے کورا ہی رہتا ہے۔ اصولِ فقہ میں اصول الشاشی اور نور الانوار کا درس لیتا ہے لیکن جیسا کہ اصولِ فقہ کے ایک طالب علم سے توقع کرنی چاہیئے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ سامنے آجائے تو وہ اصولِ احکام کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کرسکے۔ قس علیٰ ذلک۔ راقم الحروف اور اکثر رفقائے ندوۃ المصنفین نے حدیث اور منطق و فلسفہ کا درس علی الترتیب حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا رسول خاں صاحب مدظلہما سے لیا ہے۔ ان میں ہر ایک بزرگ اپنے اپنے فن کا امام تھا۔ اگرچہ کتاب ان کے سامنے بھی ہوتی تھی لیکن ان حضرات کا طریقۂ درس املاہی تھا۔ کسی مسئلہ پر تقریر کے وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مسئلہ سے متعلق فنی طور پر جتنی معلومات ہوسکتی ہیں وہ سب ان حضرات کے دماغ میں موجود ہیں وہ مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے اور اس سے متعلق اکابر ائمۂ فن کی آراء اور اُن کے دلائل بیان کرنے کے بعد خود سب پر محاکمہ اور تبصرہ کرتے اور آخر میں اپنی ایک قطعی رائے دلائل و براہین کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ لیکن یہ طریقہ صرف انھیں حضرات کے ساتھ مخصوص تھا اب وہ بات کہاں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہر حال سب سے مقدم اور اہم چیز یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے۔ اس میں شک نہیں املا کے طریقہ پر درس دینے کا اہل ہر ایک مدرس نہیں ہوسکتا اور جو صاحبِ فن ہوگا وہ معمولی تنخواہ پر دست یاب نہیں ہوسکتا اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں آجکل ایسے حضرات کا قحط بھی ہے لیکن اگر واقعی مدارسِ عربیہ میں اصلاح کرکے انھیں وقت کے تقاضوں کے مطابق مفید اور کار آمد بنانا ہے تو یہ سب کچھ اور اس کی تکمیل کے لئے جو اسباب طبعی ہوسکتے ہیں ان کا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔

دوسرا مسئلہ نصابِ تعلیم کا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم کے لئے جو کتابیں رائج ہیں ان کی جگہ ایسی کتابیں شاملِ درس کی جائیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد ہوسکتی ہیں اور آج کل بازار میں مل بھی سکتی ہیں۔ علاوہ بریں فنون کی تعلیم سے متعلق قدیم نقطۂ نظر کو بھی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً اصولِ حدیث کے سلسلہ میں صرف نخبۃ الفکر پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اسماء الرجال کا جاننا بھی حدیث کے ایک طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔ ادب کا حال ان سب سے بدتر ہے۔ ادب کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخِ ادب اور علم السنہ اور ساتھ ہی عصرِ جدید کی ادبی ترقیات اور اس کی لسانی تبدیلیوں سے باخبر ہو۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کا فنِ تنقید نہایت کامل و مکمل ہے لیکن ہمارے طلبہ اس سے بھی ناآشنا رہتے ہیں ضرورت ہے کہ ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ان تمام خامیوں کو دور کیا جائے اور اس کا نصاب ایسا بنایا جائے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم آج کل کی اصطلاح کے مطابق صحیح طور پر ادیب کہلایا جاسکے۔

معانی وبیان اور بدیع میں ہمارے ہاں سب سے زور فنِ بدیع پر رہتا ہے حالانکہ اصل چیز فصاحت وبلاغت ہے فنِ بدیع متاخرین کی ایجاد ہے اور اس سے بسا اوقات لفظی حسن پیدا کرنے کی کوشش میں اصل معنی کا خون ہوجاتا ہے حدیث کی کتابوں میں کوئی ادل بدل نہیں ہوسکتا البتہ تفسیر کی مروجہ درسی کتابوں میں ادل بدل کرنا نہایت ضروری ہے اور اصولِ تفسیر کا فن ہمارے ہاں بالکل نہیں پڑھایا جاتا اس کو بھی شاملِ درس ہونا چاہئے۔ فقہ میں کم از کم ایک کتاب ایسی ضرور ہونی چاہئے جس سے طالب علم کو حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مذاہبِ فقہ اور ان کے مبادی و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصول کا علم ہو۔ پھر ہمارے طلبا تاریخِ علوم سے ناواقف رہتے ہیں اس کے لئے مقدمہ ابن خلدون کا انتخاب یا کوئی اور کتاب جو اس مقصد کے لئے مفید ہو شاملِ درس ہونی چاہیئے۔

اب رہے علوم عصریہ! تو کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عصر کے بدل جانے کے ساتھ اب مدارسِ عربیہ کے علومِ عصریہ بھی بے وقعت ہو گئے ہیں جو چیزیں فلسفۂ قدیم کی مسلمات سمجھی جاتی رہی ہیں اب وہ بدیہی البطلان بن گئی ہیں اور اب ان کا پڑھنا صرف ایک خاص زمانہ کی عقلی رفتار کے جان لینے کی حیثیت سے تو مفید ہو سکتا ہے ورنہ علمی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں۔ مدارس میں بالعموم رسالہ ملا جلال و میر زاہد کی صرف ایک یہ بحث کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کس مقولہ سے ہے؟ پورے ایک برس میں تمام ہوتی ہے اور پھر بھی دماغ میں روشنی پیدا نہیں ہوتی اس کے بالمقابل اگر کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" پڑھائی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ فلسفہ کا ایک اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ اس سے وحی اور الہام اور بعض اور مابعد الطبیعاتی حقائق کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے پھر ہمارے ہاں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ طبیعات اور الٰہیات دونوں کے مباحث ملے جلے ہیں اور وہ بھی جتنا کچھ پڑھایا جاتا ہے صرف جزء لایتجزیٰ صورت و ہیولیٰ اور اسی قسم کے چند اور مسائل تک محدود رہتا ہے۔ موجودہ فلسفہ کا ایک اہم شعبہ فلسفۂ اخلاق ہے۔ مدارس عربیہ کے طلبا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

کہا جا سکتا ہے آخر علومِ عصریہ میں تو اور بہت سے علوم بھی شامل ہیں انھیں چھوڑ کر صرف فلسفہ کو ہی نصاب میں کیوں شامل کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اور علوم مثلاً اقتصادیات، علمِ نباتات، کیمیا اور طبیعات وغیرہ علوم معاشی یا عملی علوم ہیں۔ انسانی عقائد و افکار سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ انسان کے مذہبی اور اخلاقی و روحانی افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ذہنی کجروی اور گمراہی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر علما نے جس طرح پہلے فلسفۂ قدیم پڑھا اسی طرح اب ان کو فلسفۂ جدید پڑھ کر فکر و نظر کی گمراہی کا سدباب کرنا چاہیئے۔

ان علوم کے علاوہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ اور جغرافیہ ان چیزوں کا بھی درسِ نظامی میں شامل ہونا نہایت ضروری ہے پھر تاریخ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ مختلف قوموں اور سلطنتوں کی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اور تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے اس سلسلہ میں ابھی چند گذارشیں اور کرنی ہیں وہ آئندہ اشاعت میں پیش کی جا سکیں گی۔

© rasailojaraid.com